بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر مفتی محمد مظہر بقا☆

حدیث کی حجیت

یہ مضمون ایک صاحب کی جانب سے کئے جانے والے ان سوالات کے جواب میں تحریر کیا گیا۔

۱- قرآن تو بلاشبہ اللہ کی کتاب ہے اور دین میں حجت ہے، لیکن کیا احادیث بھی دین میں حجت ہیں؟ اگر حجت ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود انہیں قرآن کی طرح مدون فرماتے، یا وہ خلافتِ راشدہ میں مدون ہو جاتیں۔ اس کے برخلاف حضور ﷺ نے یہ حکم دیا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ اور کچھ نہ لکھو، جس نے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہو اسے مٹادے۔

حضرت عمرؓ نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا۔

۲- اصحابِ صحاحِ ستہ سب عجمی تھے اور سب تیسری صدی ہجری میں گزرے، کسی عرب نے تدوینِ حدیث کا کام کیوں نہیں کیا؟

۳- صحیفۂ ھمام ابن منبہ میں صرف ۱۳۸ احادیث ہیں، پھر حضرت ابوہریرہؓ کی ہزاروں احادیث کہاں سے آگئیں؟

۴- اصحابِ صحاح ستہ اور ان کے دور کے لوگوں کے پاس لاکھوں احادیث کہاں سے آگئیں؟ جن میں سے انہوں نے چند ہزار احادیث کو صحیح قرار دیا اور یہ سارا ذخیرہ سنا سنایا تھا، کوئی تحریری ریکارڈ پہلے سے

☆۔مکہ مکرمہ

موجود نہ تھا۔ انہوں نے اپنی فراست کے مطابق جن احادیث کو صحیح تصور کیا اپنی کتابوں میں داخل کرلیا۔ اس طرح کی انفرادی کوششوں کے متعلق یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ یقینی طور پر رسول کریم ﷺ کے ارشادات ہیں؟

۵- وحی جلی اور وحی خفی کا قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔

۶- قرآن کریم اپنی تشریح خود کرتا ہے، پھر اس کی تشریح کے لئے کسی اور چیز کی کیا ضرورت ہے؟

علما نے اس سلسلہ میں بہت سی باتیں تحریر فرمائیں ہیں۔

میں یہاں ان میں سے چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

۱۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۱)

اور ہم نے تجھ پر ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ تو لوگوں کو وہ بیان کردے جو ان پر نازل کیا گیا۔

قرآن کریم کو بعینہ پڑھ دینا یہ تلاوت کہلاتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے!

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ (۲)

یہ رسولؐ لوگوں پر (اس قرآن کی) آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔

اور اس کی تشریح کرتے ہوئے اس کے مطالب اور مضمرات کو سمجھانا، اسے تبیین (بیان کرنا) کہتے ہیں۔

اس آیت کی رو سے قرآن کی تبیین اور تشریح کا فریضہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا گیا، اور تشریح کا جو کچھ کام آپؐ نے کیا وہ احادیث رسولؐ ہی کا تو جزء ہے۔ کیا یہ فریضہ اللہ کی طرف سے اس لئے سپرد کیا گیا کہ شارح جو کچھ کہے اسے نہ مانو؟

اور اگر اللہ کا مقصود یہ ہے اور عقلِ سلیم کے نزدیک اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا کہ شارح کی بات مانی جائے تو کیا اس سے حدیث کا دین میں حجت ہونا ثابت نہیں ہوتا؟

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے!

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (۳)

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔

اس ارشاد کا تقاضا یہ ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہونا چاہئے، اور دونوں کے دائرے ایک دوسرے سے ممتاز ہونے چاہئیں ورنہ " اَطِیْعُوْا اللّٰہَ " کہنے کے بعد "وَاَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ " کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

ان دونوں دائروں کے امتیاز کو اس ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے قتال کا حکم دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قتال میں بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور مذہبی پیشواؤں کو قتل نہ کیا جائے۔ تو اطاعت کے یہ دونوں دائرے ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔

اس امتیاز کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ!

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ج (۴)

اور جس نے رسول (ﷺ) کی اطاعت کی تو اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔

گویا ان امور میں جو قرآن میں مذکور نہیں، رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنا ایسا ہی ہے جیسے اللہ کی اطاعت کرنا۔

کیا اس سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو احکام قرآن میں مذکور نہیں، صرف رسول ﷺ کے قول و فعل میں مذکور ہیں ان کا ماننا بھی ضروری ہے، اور ان کا ماننا اللہ ہی کے احکام کو ماننا ہے، کیونکہ اللہ ہی نے تو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا

اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ (۵)

اور تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ کی زندگی) میں اچھا نمونہ ہے، اس شخص کے لئے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور اللہ کو بکثرت یاد کرے۔

اُسوہ کا تعلق علم سے نہیں بلکہ عمل سے ہے۔ قرآن علم کی کتاب ہے، دین کے عملی نمونے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسوۂ رسول ﷺ کو اچھا فرمایا تو اس سے اللہ تعالیٰ کا مقصود اس کے سوا اور کیا ہے کہ رسول ﷺ کے اچھے عملی نمونے کی پیروی کی جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ یہ اچھا نمونہ ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہوں اور اللہ کی یاد بھی بکثرت کرتے ہوں، اور اس سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے تو کیا غلط ہوگا کہ جو لوگ نہ اللہ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اللہ کا بکثرت ذکر کرتے ہیں، وہ نہ اس نمونہ کو مانیں گے اور نہ اس کی اتباع کریں گے اور اس سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ جو لوگ سنت کی اتباع تو کیا، اسے دین میں حجت ہی نہیں مانتے وہ کس زمرے میں آئیں گے؟۔

۴۔ اگر ہدایت کے لئے صرف قرآن کافی ہے اور حدیث نہ دین میں حجت ہے اور نہ قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے حدیث کی ضرورت ہے تو کوئی بتائے کہ قرآن کے حکم "اقیموا الصلوٰۃ" اور اس جیسے مجمل احکام پر عمل کرنے کی کیا صورت ہے؟ نمازوں کی تعداد، ان کے اوقات، رکعات کی تعداد، قیام و قرأت اور رکوع و سجود کی تفصیلات، زکوٰۃ کا نصاب، حج کا طریقہ، یہ تمام امور کہاں سے معلوم ہوئے اور اگر حدیث حجت اور واجب الاتباع نہیں تو دور رسالت سے آج تک ہر زمانے، ہر خطے اور ہر فرقے کے ۹۹ اعشاریہ ۹ فیصد سے بھی زیادہ لوگوں نے تواتر اور تسلسل کے ساتھ اس پر کیوں عمل کیا؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حدیث حجت ہے اور دین ہی کا ایک جزو ہے؟ اور اس کے بغیر قرآن پر بھی عمل ممکن نہیں۔

عدمِ تدوین کی وجہ

تمام علماء اور محدثین لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی ذخیرہ احادیث مرتب نہیں فرمایا اور دوسروں کو بھی اس کی کتابت سے منع فرمایا، اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن کی طرح اگر حدیث کی کتابت بھی حضور ﷺ کے دور میں ہوتی تو قرآن محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔ مخلصین بھی دھوکا کھا سکتے تھے۔ صحابہ کرامؓ سے بھی سہو و نسیان ہو سکتا تھا اور پھر بعد کے دور میں فتنہ پردازوں کے لئے حدیث کو قرآن سے خلط کر دینے کا کھلا موقع ہاتھ آجاتا۔ آپ سوچئے کہ اگر دو چار فتنہ پرداز بھی کہہ دیتے کہ یہ احادیث نہیں بلکہ قرآن کی آیات ہیں اور حضور ﷺ نے انہیں خود اپنے زمانہ میں لکھوایا ہے، تو اس طرح کیا قرآن مشتبہ نہ ہو جاتا؟ اور پھر علماء اور محدثین کو قرآن اور حدیث میں امتیاز کی خدمت انجام دینی پڑتی کہ یہ قرآن ہے اور یہ حدیث، اور پھر بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ ان علماء کی بات کا کیا اعتبار ہے جو بعد کے دور میں پیدا ہوئے۔ غرض ایک مرتبہ جب قرآن مشتبہ ہو جاتا تو پھر قیامت تک اس اشتباہ کا دور کرنا ممکن نہ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حدیث کی تدوین نہ ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ آج کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ فلاں حدیث حضور ﷺ کا قول نہیں، بلکہ قرآن کی آیت ہے، اور فتنہ پردازوں نے جب اس کی راہ نہ پائی تو حدیث کے پیچھے پڑ گئے کہ یہ ذخیرہ ان ان وجوہ سے نا قابل اعتبار ہے۔

قرآن کو مختلف قبائل اپنی اپنی لغات میں پڑھتے تھے جس کی حضورؐ نے اجازت دی تھی۔ صرف اتنی سی بات کا یہ نتیجہ ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے دور تک پہنچتے پہنچتے نوبت یہاں تک آگئی کہ ہر ایک اپنے کو صحیح اور دوسرے کو غلط کہنے لگا اور بعض بعض مواقع پر تلواریں تک نکل آئیں۔ اسی لئے حضرت عثمانؓ نے قرآن کو قریش کی لغت پر مرتب کرایا، اس لئے کہ یہ انہی کی زبان پر نازل ہوا تھا، اور اگر حضرت عثمانؓ ایسا نہ کرتے تو آج تک مسلمانوں میں تلوار چلتی رہتی۔

اگر حدیث کا ذخیرہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدون ہو جاتا تو

قرآن وحدیث میں ایسا اختلاف ہو جاتا یا دشمنانِ اسلام کی طرف سے دانستہ پیدا کر دیا جاتا کہ قیامت تک کے لئے قرآن پر سے اعتماد اٹھ جاتا۔

ہندوستان میں الہ آباد تک تو گنگا اور جمنا کا پانی علیحدہ علیحدہ ہے۔ الہ آباد میں دونوں دریا مل جاتے ہیں۔ ملتے وقت بھی دونوں کا پانی بہت دور تک ممتاز رہتا ہے کہ گنگا کا پانی گندلا اور جمنا کا صاف ہے۔ لیکن آگے جا کر دونوں پانی اس طرح مخلوط ہو جاتے ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ گنگا کا پانی کون سا ہے اور جمنا کا کون سا، بالکل یہی حال قرآن وحدیث کا ہوتا۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی طرح سنت کے لکھنے کا بھی حکم دیتے تو ذرا غور فرمایئے کہ!

الف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا دور تقریباً ۲۳ سال پر مشتمل ہے اس عرصہ میں آپؐ سے کتنے اقوال، افعال اور تقاریر کا صدور ہوا ہوگا، کیا ان امور کی تعداد لاکھوں تک نہیں پہنچے گی؟

ب اس زمانہ میں کاغذ ایجاد نہ ہوا تھا، اسی لئے قرآن کریم بھی چھالوں اور ہڈیوں وغیرہ پر لکھا گیا، اگر احادیث کے لکھنے کا اہتمام بھی کیا جاتا تو اس کے لئے وہ چیزیں اتنی مقدار میں کہاں سے فراہم ہوتیں جن پر انہیں لکھا جاتا؟

ج عرب عام طور پر امی تھے اور صحابہؓ میں سے صرف چند حضرات لکھنا جانتے تھے، اگر احادیث مدون کی جاتیں تو ان کے لئے کتنے کاتب درکار ہوتے اور یہ کاتب کہاں سے آتے؟

د قرآن کریم تو کبھی کبھی نازل ہوتا تھا اور نزول کے بعد آپؐ کاتبینِ وحی کو بلا کر لکھوا دیا کرتے تھے۔ سنت یعنی آپؐ کی گفتگو، شب وروز کے اعمال، اکل وشرب، نشست وبرخاست وغیرہ لکھنے کے لئے تو کسی لکھنے والے کو ہر وقت آپؐ کے پاس موجود رہنا چاہئے تھا۔ کیا یہ ممکن یا آسان تھا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل

حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ روایات ہیں کہ انہوں نے حدیث کی کتابت اور کثرت روایت سے منع کیا اور یہ روایات آپؐ کے نزدیک قابل اعتبار ہیں۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ روایات انہی محدثین نے ذکر کی ہیں جنہوں نے حدیث کا ذخیرہ مرتب کیا ہے۔ اگر ذخیرۂ احادیث کا کوئی اعتبار نہیں تو پھر آپؐ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں ان روایات کو کیسے قبول کر لیا؟ ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جب پورا ذخیرۂ احادیث ناقابل اعتبار ہے تو حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ روایات بھی غلط اور ناقابل اعتبار ہیں۔

اگر آپ حضرت عمرؓ کے بارے میں ان روایات کا اعتبار کرتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کی کتابت اور اس کی روایت کی کثرت سے منع کیا تو پھر اس روایت کا بھی تو اعتبار کیجئے کہ حضرت عمرؓ نے اس کا ارادہ کیا تھا کہ حدیث کا ذخیرہ بھی مرتب کرا دیا جائے، لیکن ایک ماہ تک اس پر غور و فکر کرنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ ایک تو یہ کہ پچھلی امتوں نے اپنے رسولوں کی باتیں مرتب کیں اور پھر اللہ کی کتابوں کو چھوڑ کر انہی میں منہمک ہو گئے، دوسرے یہ کہ میں اس کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا کہ حدیث کو قرآن کے ساتھ خلط کیا جا سکے۔

گویا حضرت عمرؓ کے پیش نظر بھی حدیث کے مدون نہ کرنے کی وہی حکمت تھی جو حکمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تھی۔

حضرت عمرؓ نے حدیث کی کتابت سے منع کیا تھا، تاکہ قرآن میں اشتباہ نہ ہو، حدیث کی روایت سے بالکلیہ منع نہیں کیا تھا، اور چونکہ ان کے مزاج میں شدت تھی اس لئے تاوقتیکہ پورا وثوق نہ ہو نہ تو وہ حدیث کی روایت کی اجازت دیتے تھے اور نہ خود قبول کرتے تھے اور اگر حدیث ان کے نزدیک حجت نہ ہوتی تو وہ اپنے بعض فیصلوں کی بنیاد حدیث پر کیوں رکھتے۔ مثلاً جنین کی دیت، اصابع کی دیت، مجوس پر جزیہ مقرر نہ کرنا، دیت میں سے عورت کو حصہ دلانا، مجنونہ کا رجم نہ کرنا، اسی طرح استیذان کے معاملے میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت کو قبول کرنا۔ وغیرہ۔

اور اگر حدیث حضرت عمرؓ کے نزدیک دین کا جزو اور قابلِ اعتبار نہ ہوتی تو وہ خود حدیث کی روایت کیوں کرتے۔ ابن جوزی نے "تلقیح فہوم الاثر" میں لکھا ہے کہ! "حضرت عمرؓ سے ۵۳۷ احادیث مروی ہیں" ان میں سے ۸۱ احادیث صحیحین یعنی صحیح بخاری و صحیح مسلم میں موجود ہیں، ۲۶ متفق علیہ ہیں، یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہیں، ۳۴ صرف صحیح بخاری میں ہیں اور ۲۱ صرف صحیح مسلم ہیں۔

بعد کے دور میں جب قرآن اطراف عالم میں پھیل گیا اور اس میں حدیث کے مخلوط ہونے کا اندیشہ نہ رہا تو صحابہؓ نے بلا روک ٹوک حدیث کی روایت شروع کر دی، اور اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ پھر لوگوں نے حدیثیں وضع کرنی شروع کر دیں اور اس طرح جھوٹی اور سچی حدیثیں خلط ملط ہو گئیں۔

چونکہ حدیث علماء کے نزدیک حجت اور دین کا جزء ہے اس لئے اس صورت حال میں علماء نے اس کا بیڑا اٹھایا کہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا جائے، اور انہوں نے نہ صرف درست اور نادرست میں امتیاز کیا، بلکہ جو احادیث درست تھیں ان کی بھی درجہ بندی کر دی کہ کون سی حدیث کس درجہ قابل اعتبار ہے۔

حدیث کا جو ذخیرہ اس وقت موجود ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ معتبر ہے یا نہیں، کم از کم اس سے اتنی بات تو یقین کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ!

۱- صحابہؓ نے احادیث تابعین تک، تابعین نے تبع تابعین تک اور تبع تابعین نے اپنے بعد والوں تک پہنچائیں،

۲- ان تمام ادوار کے علما احادیث بھی نقل کرتے رہے، ان سے مستنبط احکام بھی بیان کرتے رہے، اور قرآنِ کریم کی تفسیر میں احادیث کو سند کے طور پر بھی پیش کرتے رہے۔

۳- تبع تابعین اور ان کے بعد کے ادوار میں علماء مختلف فریقوں میں تقسیم ہو گئے۔ بعض نے اپنی تمام تر کوششیں حدیث کے لفظ کی حفاظت پر صرف کیں اور اپنی اپنی تحقیق کی روشنی میں یہ بتایا کہ کون سی حدیث کس درجہ قبول یا رد کے قابل ہے۔ انہی لوگوں کو محدثین کہا جاتا ہے۔

دوسرے فریق نے حدیث کے معنی کی طرف توجہ کی اور اپنی تمام تر کاوشیں اس میں صرف کیں کہ منقول احادیث سے کون کون سے احکام معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں فقہاء کہا جاتا ہے۔ (بعض حضرات ایسے بھی گزرے ہیں جو بیک وقت محدث بھی ہیں اور فقیہ بھی)

بعض حضرات نے قرآن کریم کے لفظ کی حفاظت اور اس کی تفسیر پر اپنی توجہات کو مرکوز رکھا اور قرآن کی تفسیر میں احادیث کو سند کے طور پر پیش کیا۔ ان حضرات کو قرأ اور مفسرین کہا جاتا ہے۔

۴- فکری اور سیاسی اعتبار سے سنی، شیعہ، معتزلہ اور خوارج پیدا ہوئے اور سب نے احادیث کو اصولی طور پر دین میں حجت کے طور پر تسلیم کیا۔

اگر حدیث دین میں سرے سے حجت نہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ صحابہؓ سے لے کر ہر دور کے محدثین، فقہاء، مفسرین، قراء، سنی، شیعہ، معتزلہ اور خوارج، یہ تمام لوگ، جن میں علم و عقل کے سیکڑوں ہمالیہ بھی موجود ہیں، پاگلوں کا گروہ تھا، جنہوں نے اپنی عمریں ایسے فضول کام میں صرف کیں جس کا سرے سے دین میں کوئی مقام نہیں، اور عقل صرف ان کے حصے میں آئی ہے جو یہ کہیں کہ حدیث دین میں حجت نہیں۔

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابہ، سعید بن المسیبؒ زہریؒ، حسن بصریؒ، جعفر صادقؒ جیسے تابعین، ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، اور ابن حنبلؒ جیسے فقہاء، بخاریؒ، مسلمؒ جیسے محدثین، طبریؒ، قرطبیؒ، زمخشریؒ جیسے مفسرین، غزالیؒ اور رازیؒ جیسے مفکرین، پھر صحابہؓ سے لے کر آج تک کے وہ اربوں اشخاص جنہوں نے ان کی اتباع کی اور جن میں جنید بغدادیؒ، عبدالقادر جیلانیؒ، محی الدین ابن عربیؒ، بہاء الدین نقشبندؒ، معین الدین چشتیؒ، مجدد الف ثانیؒ جیسے صوفیاء، ابن سینا اور فارابی جیسے فلاسفہ، مورخین، ریاضیین، فلکیین وغیرہ ہر علم و فن کے چوٹی کے علماء بھی شامل ہیں، اگر ان سب کے بارے میں کوئی شخص یہ سوچے کہ یہ سب پاگل یا بیوقوف تھے، تو کیا خود اس کی عقل پر ماتم نہ کیا جائے گا؟

اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کرتا ہوں:

دنیا میں وہ غیر مسلم بھی ہیں جو قرآن کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصنیف مانتے ہیں، اور وہ مسلمان بھی جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے جو اس نے اپنے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کی ہے! اگر کوئی غیر مسلم یہ کہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وحی کا (نعوذ باللہ) ڈھونگ رچا کر اپنی کتاب کو اس طرح مرتب کیا کہ یہ خدا کی کتاب معلوم ہو، پھر اس کتاب میں جابجا یہ کہلوایا کہ یہ کتاب میں نے نازل کی ہے مثلاً!

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۲)

آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن میں اللہ نے خود فرمایا ہے کہ یہ میری کتاب ہے، مثلاً!

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ (۷)

کیونکہ وہ تو قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہی نہیں۔

علماء نے قرآن کے خدائی کتاب ہونے کے مختلف دلائل لکھے ہیں، مثلاً اس کا اعجاز کہ چیلنج کے باوجود کوئی اس جیسا کلام نہ لا سکا، یا قرآن کی پیشگوئیاں، وغیرہ۔

میرے خیال میں اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ ایسے شخص کو سب سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قائل کیا جائے (کیونکہ اگر کوئی شخص کسی کتاب کو خدا کی کتاب مان لے تب بھی وہ رسول کو مانے بغیر اس دین میں تو داخل ہو نہیں سکتا) اس کے بعد اس سے کہا جائے کہ اللہ کے اس سچے رسول ﷺ نے یہ فرمایا کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔

پھر جس نے رسولِ صادق و امینؐ کے قول کے مطابق قرآن کو خدا کی کتاب مان لیا، اس نے خود بخود رسولؐ کے قول کو دین میں حجت اور واجب التسلیم مان لیا، اور وہ بھی اس طرح کہ اگر وہ رسولؐ کے اس قول کے مطابق قرآن کو خدا کی کتاب نہیں مانتا تو وہ دین اسلام ہی سے خارج ہوا جاتا ہے۔

اور اگر کسی بھی آسمانی کتاب کو اللہ کی کتاب ماننے کے لئے رسولؐ کے قول کو بنیاد نہ بنایا جائے، تو پھر قرآن ہی کیا توراۃ، انجیل، زبور بھی ہاتھ سے گئیں، کیونکہ اللہ نے خود تو لوگوں کے کانوں میں نہیں پھونکا کہ یہ میری کتابیں ہیں۔ ہر رسول نے اپنے اوپر نازل کردہ کتاب کے بارے میں کہا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اگر رسول کے قول کو حجت نہ مانا جائے

تو پھر اسلام ہی کیا ہر دین کی بنیادیں منہدم ہو جاتی ہیں۔

پھر اگر کوئی شخص جرأت کر کے یہ کہہ دے کہ جس مسلمان، عیسائی یا یہودی نے رسول اللہ ﷺ کے قول کو حجت نہیں مانا تو وہ اپنے دین ہی سے خارج ہو جاتا ہے تو کیا یہ غلط ہوگا؟

جب یہ معلوم ہو گیا کہ حدیث دین میں حجت ہے اور حدیث کے بغیر قرآن پر عمل ممکن نہیں، تو پھر یہ معلوم کرنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا اور کیا کام کیا امت کا فرض ہے اور امت میں سے یہ فرض صرف وہی لوگ کماحقہ ادا کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں حدیث کے لئے وقف کی ہوں۔ چنانچہ انہوں نے محنتِ شاقہ کے بعد یہ کام بحسن وخوبی کیا اور بتا دیا کہ یہ حضور ﷺ کی بات ہے اور یہ بات آپ کی طرف غلط طور پر منسوب کی گئی ہے۔ پھر جو بات حضور ﷺ کی طرف منسوب تھی (غلط طور پر نہیں) اس کی درجہ بندی بھی کر دی کہ کون سی حدیث کس درجہ اعتماد کے لائق ہے، یعنی صحیح، حسن، ضعیف، مرسل، منقطع، معضل، شاذ، منکر وغیرہ۔

ایک کاشتکار جب اپنے کھیت میں گیہوں بوتا ہے تو اس کے ساتھ کچھ کچرا بھی اُگ آتا ہے۔ کسان یہ نہیں کرتا کہ کچرے کی وجہ سے پورے کھیت کو آگ لگا دے، بلکہ کچرا نکال دیتا ہے اور صرف گیہوں کے پودے برقرار رکھتا ہے۔ یہی عمل محدثین نے کیا، اللہ ان پر رحمتیں نازل فرمائے۔

اگر کوئی شخص کسی ایسے ملک میں جہاں بدقسمتی سے دواؤں میں آمیزش ہوتی ہو، اور جہاں طبیبوں کے ساتھ عطائی بھی دکانیں سجائے بیٹھے ہوں، کسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اس کی وجہ سے کیا وہ ہر دوا اور ہر طبیب سے پرہیز کر کے موت کو ترجیح دے گا یا کوشش کرے گا کہ اسے صحیح دوا اور صحیح طبیب دستیاب ہو جائے۔ اگر شفا پانا ہے اور شفا کون نہیں چاہتا، تو اسے صحیح طبیب کے انتخاب اور صحیح دوا کے استعمال کے بغیر چارہ نہیں۔

یہی حال روحانی بیماری کا ہے کہ اگر کوئی شخص روحانی موت چاہتا ہے تو آمیزش کی وجہ سے تمام حدیثوں کو ترک کر دے اور اگر روحانی شفاء چاہتا ہے تو صحیح احادیث کا انتخاب کر کے ان پر عمل کرے۔

دراصل حجیتِ حدیث کے منکرین کی کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے رسولؐ کی شخصیت سے کاٹ دیا جائے کیونکہ بیشتر پابندیاں حدیث کو حجیت ماننے اور اس پر عمل کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر حدیث کی حجیت ہی کا انکار کر دیا جائے تو یہ پابندیاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور انسان بڑی حد تک آزاد زندگی بسر کر سکتا ہے۔ شراب بھی پیئے تو کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں شراب کو کہیں حرام نہیں کہا گیا۔

اور یہ طرز فکر وہ ہے جس کے بارے میں جہاں تک یاد ہوتا ہے، مولانا مودودی علیہ الرحمہ نے بڑی نفیس بات فرمائی ہے کہ دین میں رہتے ہوئے دین سے نکلنے کا اس سے زیادہ آسان اور کوئی طریقہ نہیں کہ حدیث کا انکار کر دیا جائے۔

۴- عربوں کے بجائے عجمیوں کے ہاتھوں حدیث کی تدوین

اگر آپ اسلام سے پہلے کے عرب و عجم کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو آپ کو یہ صاف نظر آئے گا کہ عربوں میں تصنیف و تالیف کا رواج تو کیا ہوتا وہ لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتے تھے۔

اس کے برخلاف یہ عجمی جنہوں نے احادیث مرتب کیں اس قوم کے افراد تھے جن میں علم کا چرچا تھا اور علوم کے مدون ذخیرے ان کے پاس موجود تھے۔ عربوں کے غیر علمی ذوق اور عجمیوں کے علمی ذوق کی وجہ سے حدیث کی تدوین عجمیوں کے ہاتھوں سرانجام پائی،

اور حدیث ہی کیا کون سا علم ہے جس میں عربوں نے کوئی اعلیٰ درجے کا کارنامہ انجام دیا ہو، منطق، فلسفہ، کلام، تفسیر، معانی، بیان، بلاغت، صرف، نحو، فقہ، اصول فقہ، تاریخ، جغرافیہ، عروض، طب، علم الحیوانات، نجوم، ریاضی، علم السیاسۃ، علم المناظرۃ، ان تمام علوم کی مستند کتابیں بھی عجمیوں ہی نے مرتب کیں۔ قاموس اور لسان العرب جیسی لغت کی کتابیں کہ آج تک عرب بھی اسی کو مستند سمجھتے ہیں جو ان میں یا ان جیسی کتابوں میں ہے، یہ کتابیں کیا کسی عرب کی لکھی ہوئی ہیں؟

پھر اگر حدیث کی تدوین کا سہرا بھی عجمیوں کے سر رہا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

دوسری بات یہ کہ عرب اپنے غیر علمی مزاج کے ساتھ ساتھ تلوار کے دھنی

تھے اور اسلام لانے کے بعد اس کی اشاعت ان کا اولین مطمحِ نظر تھا۔ انہیں اتنی فرصت کہاں تھی کہ علوم اور ان کی تدوین کی طرف متوجہ ہوتے، اور اگر اگلے عرب جہاد اور اسلام کی اشاعت میں مشغول نہ ہوتے تو کیا آج مسلمان اس تعداد میں موجود ہوتے جتنے کہ ہیں؟

جس طرح ٹریکٹر چلانے والا زمین کو ہموار کر دیتا ہے کہ اب اس میں کاشتکار جو چاہے کاشت کرے، اسی طرح ان عربوں نے، اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ اسلام کے لئے وسیع و عریض زمین ہموار کر دی تاکہ مختلف لوگ اپنے اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق علوم کی کاشت کریں۔

۳- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دیگر محدثین

آپ نے لکھا ہے کہ صحیفۂ ہمام ابن منبہ میں صرف ۱۳۸ حدیثیں ہیں، پھر ان کی اتنی احادیث کہاں سے آگئیں۔

واقف کار جانتے ہیں کہ خاص طور پر یہودی مستشرقین حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے اس لئے پڑے ہوئے ہیں کہ کعب احبار سے ان کی ایک روایت یہ ہے کہ توراۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام موجود تھا جو یہود نے نکال دیا۔

اگر ابو ہریرہؓ کو رد کر دیا جائے تو یہ حدیث خود بخود رد ہو جاتی ہے۔

بہر حال اگر صحیفۂ ہمام ابن منبہ میں صرف ۱۳۸ حدیثیں ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی کل مرویات صرف اتنی ہیں۔ ہمام بن منبہ نے ان سے جتنی احادیث سنیں، اس کتاب میں قلمبند کر دیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے دوسرے شاگرد بھی تو ہیں، مثلاً سعید بن المسیب، عروہ ابن الزبیر، قبیصہ ابن ابی ذویب، سلیمان بن یسار، سالم بن عبداللہ بن عمر، محمد بن سیرین، عطاء بن ابی رباح، عطاء بن یسار وغیرہ۔ اور بخاری کے قول کے مطابق آٹھ سو اشخاص نے ان سے روایت کیا ہے۔ اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات کی تعداد اگر دو ہزار سے متجاوز ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات کی کثرت پر خود بعض صحابہؓ کو تعجب تھا اور خود حضرت ابو ہریرہؓ نے انہیں یہ جواب دیا تھا کہ قریش تجارت اور انصار کاشتکاری میں مصروف رہتے تھے اور میں تو ہمیشہ مسجدِ نبویؐ میں حاضر رہتا، خواہ میرا پیٹ بھرا

ہو یا خالی، اس لئے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننے کا جتنا موقع ملا، دوسروں کو کہاں نصیب ہوا۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے سوءِ حفظ کی شکایت کی تو حضور ﷺ نے انہیں اپنی چادر پھیلانے کے لئے کہا، پھر اس میں اپنے دست مبارک سے کچھ ڈالا، پھر فرمایا کہ اسے اپنے سینے سے لگالو۔ چنانچہ انہوں نے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد سے وہ کوئی بات نہیں بھولے۔ تمام صحابہؓ، تابعین، حسن بصری، امام شافعی اور امام بخاری اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ صحابہؓ میں حضرت ابو ہریرہؓ کا حافظہ ممتاز تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ تو حضور ﷺ کا یہ تصرف بھی شامل تھا، لیکن حضرت ابن عباسؓ جیسے دوسرے صحابہؓ بھی موجود تھے جن کے حافظے انتہائی قوی تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، ہر قوم میں اور ہر زمانے میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو غیر معمولی حافظوں کے مالک تھے۔

حضرت زہری جب باہر نکلتے تھے تو اپنے کانوں کو بند کرلیا کرتے تھے، سبب دریافت کرنے پر فرمایا کہ جو چیز بھی میرے کانوں پر پڑ جاتی ہے وہ کبھی حافظے سے نہیں نکلتی، اس لئے میں فضول باتیں سننے سے پرہیز کرتا ہوں۔

امام بخاری دس گیارہ سال کی عمر میں جب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ طلب حدیث کے لئے نکلے تو جتنے عرصے میں ان کے ساتھیوں نے مختلف شیوخ سے پندرہ ہزار حدیثیں لکھ لیں امام بخاری نے ایک حدیث بھی نہ لکھی، ان کے ایک ساتھی حاشد بن اسماعیل نے ان سے کہا کہ جب تم لکھتے نہیں تو اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ وقت کہاں برباد کر رہا ہوں جو کچھ تمہارے اوراق میں ہے وہ سب میرے حافظے میں موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے پندرہ ہزار حدیثیں سنا دیں، اس طرح کہ لکھنے والوں سے جو غلطیاں ہو گئیں تھیں وہ بھی انہوں نے امام بخاری سے سن کر درست کیں۔

امام بخاری کا یہ مشہور واقعہ حدیث سے دلچسپی رکھنے والے تمام لوگ جانتے ہیں کہ بغداد کے علماء نے جب امام بخاری کی بغداد میں آمد کی خبر سنی، تو بعض بڑے محدثین نے جمع ہو کر سو حدیثوں کو الٹ پلٹ کر کے کسی حدیث کی سند کسی کے ساتھ اور کسی کی کسی کے

ساتھ ملادی اور دس دس حدیثیں دس آدمیوں کو دیدیں کہ وہ ان کے بارے میں امام بخاری سے دریافت کریں۔ چنانچہ ان کی بغداد آمد پر ایک مجلس منعقد کی گئی اور اس میں ہر ایک نے اپنی اپنی دس دس احادیث پیش کیں۔ امام بخاری ہر ایک کے جواب میں لا أعرف (میں نہیں جانتا) کہتے رہے۔ جب سب لوگ ختم کر چکے تو امام بخاری نے ترتیب وار تمام احادیث پر گفتگو کی، یہ حدیث میرے سامنے اس طرح پڑھی گئی یہ اس طرح، تمام حدیثوں کو ان کی صحیح سندوں کے ساتھ بیان کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علمائے بغداد نے اعتراف کرلیا کہ آج عالم اسلام میں بخاری سے بڑھ کر حدیث کا کوئی عالم نہیں۔

حدیث میں امام مسلم کے مرتبہ سے کون ناواقف ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امام مسلم، امام بخاری کے پاس آئے، ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا کہا کہ اے استاد الاساتذہ، اے سید المحدثین، اے حدیث کی علتوں کے طبیب، مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے قدم چوم لوں، امام مسلم ہی نے ایک مرتبہ امام بخاری کو مخاطب کر کے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ دنیا میں آپ کی کوئی نظیر نہیں۔

امام بخاری کے اساتذہ: علی بن المدینی، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، اسحاق بن راھویہ، سب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اور بعض محدثین کے بقول بخاری علم حدیث میں اپنے اساتذہ پر بھی فائق ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مشہور محدثین خصوصاً ان کے اکابر سے چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کی احادیث کو محفوظ کرانا چاہتا تھا اس لئے انہیں غیر معمولی حافظوں سے نوازا تھا۔

آج کی اصطلاح کے مطابق ان کے دماغوں کو سپر کمپیوٹر کہا جاسکتا ہے۔

محدثین کے حافظوں کی یہ قوت کوئی افسانہ نہیں، حقیقت ہے۔ میں نے استاذ عبدالعزیز میمنی کو دیکھا جو پہلے علی گڑھ اور پھر کراچی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ انہیں زمانہ جاہلیت سے عباسی دور تک کے تقریباً ایک لاکھ عربی اشعار یاد تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے سامنے ایک مصرعہ پڑھا گیا ہو اور انہوں نے پورا قصیدہ نہ سنادیا ہو۔

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حافظہ عطا فرمایا تھا۔ مجھ سے میرے وطن کے ایک بزرگ مفتی عبدالمجید صاحب نے، جو مولانا انور شاہ صاحبؒ کے شاگرد تھے، اور انہی کے پاس رہا بھی کرتے تھے۔ بیان کیا کہ فجر کی نماز کے بعد مولانا اپنے کتب خانے میں آنکھیں بند کئے بیٹھ جاتے تھے کبھی کبھی اٹھ کر کوئی کتاب نکالتے اور اس کے کچھ اوراق الٹ پلٹ کر پھر اپنی جگہ رکھ دیتے۔ ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا کہ حضرت آپ اس وقت کون سا وظیفہ پڑھتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا یہ میرے وظیفے کا وقت نہیں، مطالعے کا وقت ہے۔ کسی بھی کتاب کے کسی خاص موضوع کو ذہن میں لے کر کتاب کو پڑھتا جاتا ہوں اگر کہیں شبہ ہوتا ہے تو کتاب کھول کر دیکھ لیتا ہوں۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ مصر تشریف لے گئے تو انہوں نے دارالکتب المصریہ میں "نورالایضاح" نامی فقہ کی ایک کتاب دیکھی اور چاہا کہ اسے نصاب میں داخل کرنے کے لئے نقل کرالیا جائے۔ نقل کی اجازت طلب کی تو اجازت نہ ملی۔ انہوں نے کتب خانے ہی میں بیٹھ کر اسے پڑھا اور باہر آکر پوری کتاب لکھوادی۔ پھر مقابلے کی اجازت مل جانے پر جب اصل سے مقابلہ کیا تو کہیں کہیں معمولی سے الفاظ کا فرق نکلا جو درست کرلیا گیا۔ یہ کتاب آج بھی درسِ نظامی میں فقہ کی سب سے پہلی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے نمونے دکھانے کے لئے کسی کو ارسطو اور افلاطون بنادیتا ہے اور کسی کو زہری اور بخاری۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس غیر معمولی حافظے کے ساتھ ساتھ بخاری کو مرتب کرنے میں ان کے تقویٰ اور ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا۔ انہوں نے سولہ سال کی مدت میں کتاب مرتب کی ہے وہ بھی اس طرح ایک حدیث اس کتاب میں درج کرنے سے پہلے غسل کرکے دو رکعت پڑھتے اور استخارہ کرتے تھے۔ جب استخارہ بھی علم و حفظ کا ساتھ دیتا تو اس کے بعد وہ اس حدیث کو کتاب میں درج کرتے تھے۔ اسی لئے تو پوری امت اس پر متفق ہے کہ قرآن کے بعد بخاری سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے۔

کیا دنیا میں کوئی ایسی مثال ہے کہ کسی ایسے عظیم الشان حافظے والے شخص نے اتنی

مدت میں اس احتیاط و تقویٰ کے ساتھ ایسی کتاب لکھی ہو؟

۴- لاکھوں احادیث کی حقیقت

(الف) حدیث دو چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک متن یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول، فعل یا تقریر، دوسری سند۔

جہاں تک متن کا تعلق ہے ان کی تعداد بقول شاہ ولی اللہ دس ہزار کے قریب ہے لیکن یہ احادیث (متون) جن سندوں سے مروی ہیں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی صحابیؓ سے کوئی حدیث سو آدمیوں نے سنی اور ان سو میں سے ہر ایک سے سو سو آدمیوں نے سنا، پھر ان میں سے ہر ایک سے سو سو آدمیوں نے سنا تو تیسرے طبقے ہی میں سندوں کی تعداد گیارہ لاکھ دس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ حدیث یعنی متن تو صرف ایک ہے، لیکن سندوں کے اعتبار سے، محدثین کی اصطلاح کے مطابق، اسے لاکھوں ہی میں شمار کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ دور نبوت میں کیا آپؐ نے دس ہزار باتیں بھی نہیں فرمائی ہوں گی؟ ہر شخص ایک ایک دن میں سیکڑوں باتیں اور کام کرتا ہے۔ اگر حضور ﷺ کی دس ہزار باتوں کو ایک بات یومیہ کے حساب سے بھی مان لیں تو نبوت کے ۲۳ سال میں ان کی تعداد آٹھ ہزار دو سو اسی ہو جاتی ہے۔ پھر اگر آپؐ سے دس ہزار باتیں منقول ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

(ب) آپ کے خیال میں قابلِ اعتبار وہ باتیں ہیں جو کسی کتاب میں مدون ہوں، سنی سنائی باتیں قابلِ اعتبار نہیں۔

میرے محترم! پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن بھی تو صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یاد کیا تھا، کاتبینِ وحی تو معدودے چند تھے، جنہوں نے قرآن کو متفرق طور پر پتوں، چھالوں، ہڈیوں اور چمڑوں پر لکھا تھا، جبکہ قرآن کے حافظ صحابہؓ کاتبینِ وحی سے تعداد میں کہیں زیادہ تھے، اور انہوں نے لکھے ہوئے ذخیرے سے قرآن حفظ نہیں کیا تھا، حضور ﷺ سے سن کر حفظ کیا تھا۔

جب بیر معونہ کے موقع پر ۷۰ ستر حفاظ شہید ہوئے تو حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر حضرت ابو بکرؓ کو جمع قرآن کی طرف متوجہ کیا کہ اس طرح تو قرآن ضائع ہو جائے گا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کریم کو ایک جگہ لکھوا کر محفوظ کرا دیا ہوتا اور اس طرح اس کا اصل نسخہ یکجا موجود ہوتا تو صحابہؓ کی شہادت سے قرآن کے ضائع ہونے کا کیا خطرہ تھا؟

پھر یہ کہ قرآن کے لکھنے کا حکم تو حضور ﷺ نے مدینہ میں دیا تھا، اس سے پہلے مکہ کی تقریباً تیرہ سالہ زندگی میں جو آیات نازل ہوئیں وہ تو صرف حضور ﷺ کے اور صحابہؓ کے سینوں میں محفوظ تھیں۔

قرآن کی کتابت کا حکم بھی حضور ﷺ نے مزید احتیاط کے طور پر دیا تھا۔ جو یقیناً وحی خفی پر مبنی تھا۔ ورنہ قرآن میں کہیں موجود نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو کتابت قرآن کا حکم دیا ہو۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ (۸)

بلکہ یہ واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنہیں علم (اس کا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے) دیا گیا۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ کہ سفینوں کے مقابلے میں ہمارے سینے قرآن کی حفاظت کا اصل ذریعہ ہیں۔ آج بھی قرآن میں ردوبدل کر کے اسے طبع کرا دیا جائے تو ایک حافظ بچہ بھی اسے فوری طور پر رد کر دے گا۔ اس کے برخلاف حافظ کے سینے میں جو قرآن موجود ہے اس میں کوئی شخص ادنیٰ سی غلطی بھی نہیں کر سکتا۔

قرآن میں ردوبدل کر کے اسے طبع کرا دینا کوئی فرضی بات نہیں۔ لوگوں کی طرف سے اس کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ امریکہ کے ایک شیعہ پروفیسر نے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا، اپنی دانست میں قرآن کریم کو نزول کی تاریخ ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے طبع کرایا ہے۔ کراچی یونیورسٹی کیمپس میں ایک صاحب کے مکان پر انہوں نے چند حضرات کو جمع کر کے اپنا یہ مطبوعہ قرآن دکھایا، میں بھی موجود تھا۔ میں نے چند آیات سنا کر ان سے دریافت کیا کہ ان سے پہلے اور ان کے بعد کے مضامین تو بالکل مختلف ہیں۔ آپ نے ان

میں کس ترتیب کا لحاظ رکھا ہے؟ تو جواب دینے کی بجائے چیں بچیں ہو کر فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ جیسے مولوی اسے کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔(یہ واقعہ آج سے تقریباً بائیس سال پہلے کا ہے)۔

آج سے ہزار سال بعد بھی اگر کوئی شخص ان کے اس تحریف کردہ قرآن کو پیش کر کے یہ کہنا چاہے کہ قرآن کا کوئی اعتبار نہیں تو ایک حافظ کسی صحیح مطبوعہ قرآن سے مقابلہ کر کے نہیں بلکہ اپنے سینے میں محفوظ قرآن کی بنیاد پر فوری طور پر کہہ دے گا کہ اس قرآن میں تحریف کی گئی ہے۔

ہارون الرشیدؒ نے ایک یہودی سے اسلام لانے کے لئے کہا، اس نے توقف کیا کچھ عرصہ بعد وہ اسلام لانے کے لئے ہارون الرشید کے پاس پہنچا۔ ہارون نے سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس عرصہ میں میں نے تحریف کے ساتھ توراۃ لکھی اور کتب فروش کے پاس لے گیا تو اس نے کچھ اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے اور کتاب خرید لی۔ پھر میں نے انجیل کے ساتھ بھی یہی کیا، اس نے انجیل بھی خرید لی۔ اس کے بعد میں نے قرآن کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔ کتب فروش نے کچھ اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے اور یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس میں تحریف کی گئی ہے۔ اس سے میں نے سمجھا کہ آج اگر کوئی آسمانی کتاب تحریف سے محفوظ ہے تو صرف قرآن ہے۔

ذرا آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ منقول علوم کا بیشتر ذخیرہ سنی سنائی باتوں ہی پر تو مشتمل ہے۔ تاریخ ہی کو لیجئے، اس میں مؤرخ کے مشاہدات کم اور روایات زیادہ ملیں گی اور جس زمانے میں انسان کتابت جانتا ہی نہ تھا اس زمانہ میں رویات پر اعتماد کئے بغیر اور انہیں سینوں میں محفوظ رکھے بغیر چارہ کیا تھا؟ عربوں کو تو نہ صرف اپنے بلکہ گھوڑوں تک کے انساب زبانی یاد رہتے تھے، اور بعد میں انہی کی زبانی روایات کی بنیاد پر کتابیں لکھی گئیں۔

(ج) یہ بات کہ محدثین نے صرف اپنی ذاتی فراست اور بصیرت کی بنیاد پر کسی حدیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اول تو یہ بات صحیح نہیں، اور اگر صحیح بھی ہو تو اس سے انکار کی کیا وجہ ہے۔ ایک اصلی ہیرا ہو اور اس کے ساتھ شیشے کو صاف کر کے اسی ساخت کا نقلی ہیرا بنا دیا جائے تو عام آدمی کے لئے تو دونوں میں

تمیز ممکن بھی نہ ہوگی لیکن جوہری ایک نظر میں بتادے گا کہ یہ ہیرا ہے، یہ شیشہ، اگر کسی جوہری میں یہ صلاحیت ہوسکتی ہے تو کسی محدث میں جس نے اپنی پوری زندگی حدیث کے فن میں صرف کی ہو، یہ صلاحیت کیوں نہیں ہوسکتی کہ اپنے علم اور اپنی فراست کی بنا پر یہ بتادے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور یہ صحیح نہیں۔

(د) کسی واقعے کا راوی اگر ایک شخص ہو اور اسے اس بنا پر رد کر دیا جائے کہ یہ انفرادی روایت ہے تو اگر اسی واقعے کی روایت مختلف سندوں کے ساتھ دس آدمی کریں تو کیا اس صورت میں بھی اس واقعہ کا محض اس بنا پر انکار کر دیا جائے گا کہ یہ ہر ایک کی انفرادی روایت ہے؟

پھر اگر کوئی حدیث تمام کتب حدیث میں اپنی اپنی مستقل سندوں کے ساتھ مروی ہو تو کیا اسے بھی اسی بنا پر رد کر دیا جائے گا کہ یہ ہر ایک کی انفرادی روایت ہے؟ اگر ایسی روایت کو بھی رد کر دیا جائے تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہہ دے کہ ایک انچ موٹی لکڑی کو ہاتھ سے توڑا جاسکتا ہے تو اگر ایسی دس لکڑیاں یکجا کر دی جائیں تو ان کے مجموعے کو بھی توڑا جاسکتا ہے، کیونکہ ہر لکڑی ایک انچ موٹی ہی تو ہے۔

ایسے شخص کی عقل کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

(ہ) محدث اگر زبانی نہیں بلکہ اپنی کتاب سے روایت کرے تو بہت سے اکابر محدثین تو اسے قبول بھی نہیں کرتے تھے مثلاً اوزاعی، زھری، نخعی اور قتادۃ،

آمدی الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں کہ ایک روایت سماع سے ہو، دوسری کتابت سے تو سماع کی روایت کو ترجیح ہوگی۔

وجہ یہ ہے کہ کتابت میں تو تحریف کا احتمال ہے، حافظہ میں کسی تحریف کا احتمال نہیں،

۵- وحی جلی اور وحی خفی کا فرق

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے جو وحی قرآن کی شکل میں موجود ہے اسے علماء کی اصطلاح میں وحی جلی کہا جاتا ہے اور جو صرف حدیث و سنت کی شکل میں ہے۔ اسے علماء وحی خفی کہتے ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ○ (۹)

سے استدلال کرتے ہوئے علماء کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کو جو کچھ ملا ہے خواہ وہ قرآن ہو یا غیر قرآن وہ سب وحی ہے۔ جو قرآن کی شکل میں ہے اس کے لئے علماء نے وحی جلی کی اصطلاح مقرر کی ہے اور غیر قرآن کو وحی خفی کا نام دیا ہے تاکہ دونوں میں امتیاز ہو سکے۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ مذکورہ آیت میں "ھو" کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو آپؐ نے اپنی خواہش سے نہیں گھڑا بلکہ یہ اللہ کی طرف سے وحی کیا گیا ہے۔

آپؐ نے بھی غالباً اسی خیال کے تحت لکھا ہے کہ!

"وحی جلی اور خفی کا فرق قرآن میں نہیں ملتا"

اس لئے جو بھی وحی ہے وہ صرف قرآن کی شکل میں ہے۔

قرآن کریم میں ان دونوں اصطلاحات کا صراحت سے ذکر نہ ملنے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اگر آپ غور فرمائیں تو واقع میں دونوں کو موجود پائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد بھی سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے، لیکن آپؐ کی آرزو یہ تھی کہ کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ مقرر فرما دیا۔ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم تو قرآن کریم میں موجود ہے، لیکن اس سے پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم قرآن میں کہیں موجود نہیں۔ حالانکہ یہ بھی یقیناً اللہ ہی کی طرف سے حکم تھا کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ آپؐ نماز تو پڑھیں اللہ کے حکم سے اور رخ اپنی طرف سے مقرر کر لیں۔

اور اگر اللہ کے حکم کے بغیر، صرف اپنی رائے سے حضور ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کیا کرتے تھے تو پھر اس آرزو کی کہ کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا جائے اور اللہ کے حکم کے انتظار کی کیا ضرورت تھی؟ خود ہی جب چاہتے کعبہ کی طرف رخ کر لیتے۔ معلوم ہوا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا یہ بھی اللہ کے حکم ہی سے تھا، اسی لئے آپؐ کو اللہ ہی کی طرف سے اس حکم کی تبدیلی کا انتظار تھا۔

رسول کو اللہ کی طرف سے جو بات معلوم ہوتی ہے، وحی کے ذریعے معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے بیت المقدس اور پھر کعبہ کی طرف رخ کرنا بھی آپ کو وحی کے ذریعے ہی معلوم ہوا۔ کعبہ کا قبلہ ہونا قرآن سے معلوم ہوا، اس کو وحی جلی کہتے ہیں، اور بیت المقدس کا قبلہ ہونا، یہ بھی اللہ کی طرف سے وحی کی بنیاد پر تھا، لیکن چونکہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں اسے وحی خفی کہتے ہیں۔

کسی چیز کے ثبوت کے لئے اس کا صراحۃً ذکر ضروری نہیں، اشارت، اقتضاء اور دلالت سے بھی احکامات ثابت ہوا کرتے ہیں۔ قبلے کے سلسلے میں میں نے جو کچھ عرض کیا اس کی روشنی میں کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ قرآن کے اقتضاء ہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وحی کے علاوہ جو قرآن کی شکل میں موجود ہے اور جسے وحی جلی کہا جاتا ہے، وحی کی ایک اور صورت بھی ہے جس کے مطابق آپؐ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اسی کو علماء نے وحی خفی کی اصطلاح سے تعبیر کر لیا۔

یا مثلاً وہ احادیث جنہیں قدسی احادیث کہا جاتا ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے درانحالیکہ قرآن میں ان کا ذکر نہیں۔

اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱- یا تو اللہ نے اپنے رسول کو قرآن کے سوا کچھ نہیں بتایا، اور قرآن کے سوا جس چیز کو رسول ﷺ نے اللہ کے طرف منسوب کیا اس میں انہوں نے نعوذ باللہ جھوٹ بولا،

۲- یا اللہ نے خود آپ کو بتایا۔ اور اللہ اپنے رسول کو جو کچھ بتاتا ہے اسی کو وحی کہا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ باتیں قرآن میں مذکور نہیں تو جس طرح بھی وہ باتیں بتائی گئی ہیں اسی کو وحی خفی کہتے ہیں۔

یہ مسلمہ اصول ہے کہ اصطلاحات کے بارے میں کوئی دارو گیر نہیں ہوتی۔ صرف، نحو، معانی اور بیان کی اصطلاحات کو قدیم عرب جانتے بھی نہ تھے، بعد والوں نے ہر فن کے لئے علیحدہ علیحدہ اصطلاحات مقرر کر لیں، اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لہذا اگر قرآن میں وحی جلی اور وحی خفی کی اصطلاحات کا ذکر نہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے،

واقعۃً موجود تو دونوں قسمیں ہیں۔

۶- قرآن کریم اپنی تشریح خود کرتا ہے، کسی اور چیز کی کیا ضرورت ہے؟

اس کا جواب حجیت حدیث کے سلسلے میں پہلے دیا جا چکا ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کا حکم تو قرآن میں دیا گیا، لیکن ان کی تشریح قرآن میں کہاں ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرتا ہوں!

قرآن ہمیں سورۂ فاتحہ میں اس دعا کی تلقین کرتا ہے کہ!

اے اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھلا ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا، نہ ان لوگوں کی جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان کی جو گمراہ ہیں۔

پھر قرآن کریم ہی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جن پر اللہ کا انعام ہوا وہ چار فریق ہیں! انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین۔

اب جو شخص دین میں حدیث کی حجیت سے انکار کرتا ہے یا پورے ذخیرۂ حدیث کو ناقابلِ اعتبار سمجھ کر اس سے دست بردار ہوتا ہے، اس سے دریافت کیجئے کہ حسب ذیل دو دعاؤں میں سے وہ کس کا انتخاب کرے گا۔

۱- اے اللہ کریم، ھٹی، گولڈ زھیر، شاخت، چکڑالوی، پرویز اور انہی جیسے افکار رکھنے والے دوسرے منکرینِ حدیث کے ساتھ میرا حشر فرما۔

۲- اے اللہ صدیقین، شہداء، اور صالحین (جن میں سے کوئی بھی منکرِ حدیث نہیں) کے ساتھ میرا حشر فرما۔

جو شخص بھی اسلام کو مذہبِ حق اور قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہے اور اس کے نتیجے میں حساب و کتاب اور جنت دوزخ کا قائل ہے کیا وہ اپنے لئے پہلی دعا کا انتخاب کرے گا؟ اگر نہیں، اور یقیناً نہیں، تو دوسری دعا سے جو راہ معلوم ہوتی ہے کیا صرف وہی راہ صحیح نہ ہوگی؟

حوالہ جات

۱۔ سورۂ نحل آیت ۴۴،

۲۔ سورۂ جمعہ آیت ۲،

۳۔ سورۂ نساء آیت ۵۹

۴۔ ایضاً، آیت ۸۰،

۵۔ سورۂ احزاب آیت ۲۱،

۶۔ سورۂ حجر، آیت ۹،

۷۔ سورۂ ابراہیم آیت ۱،

۸۔ سورۂ عنکبوت آیت ۴۹،

۹۔ سورۂ نجم، آیت ۳-۴،

ابتدائے اسلام سے اس وقت تک حدیث کا ایک خاص مقام مسلمانوں کی دینی زندگی میں رہا ہے، یہی اس کا طبعی مقام ہے۔ خصوصاً حدیثوں کا وہ ذخیرہ جس کی اصطلاحی تعبیر "خبرِ احاد" سے محدثینِ کرام فرماتے ہیں۔ بہر حال قرآن اور قرآنی مطالبات کے عملی قوالب و تشکیلات کے سوا مسلمانوں کی دینی زندگی کی تعبیر میں اول سے آخر تک "حدیث" بھی شریک ہے، یہ ایک ایسی ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جس کا انکار وہ بھی نہیں کر سکے جو مسلمان نہیں ہیں۔ اس واقعے کا انکار ایک ایسے واقعے کا انکار ہے جس کا علم تواتر کی راہ سے پھیلا ہوا ہے۔ منکرینِ حدیث اگر اس واقعے کے منکر ہیں، تو وہ خود بھی جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں، ایک ایسا دعویٰ کر رہے ہیں جسے خود ان کا دل بھی جھٹلا رہا ہے۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

(تدوینِ حدیث ص ۱)